قرآن کریم میں تمام انبیاء کا ذکر کیوں نہیں؟

تحریر و تحقیق:

مولانا ابو الکلام آزاد

کمپوزنگ: مشتاق احمد

www.facebook.com/payamequran

اس سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہے کہ قرآن نے اگرچہ یہاں اور دیگر مقامات میں چند خاص خاص دعوتوں اور قوموں ہی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اسکا دعویٰ عام ہے اور اسی پر یہ استدلال مبنی ہے اس نے جا بجا یہ بات واضح کر دی ہے کہ ہدایت وحی کا ظہور جمّعیتِ بشری کا عالمگیر واقعہ ہے۔ اور کوئی قوم نہیں جس میں اللہ کے کسی رسول کا ظہور نہ ہوا ہو۔ نیز یہ کہ بے شمار قومیں دنیا میں گُذر چکی ہیں جن کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے چنانچہ سورہ یونس کی آیت ۴۷ میں گُزر چکا ہے

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لاَ يُظْلَمُونَ

اور دوسرے مقامات میں فرمایا

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿الرعد:۷﴾

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ﴿النحل:۳۶﴾

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ﴿فاطر:۲۴﴾

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ﴿ابراھیم:۹﴾

لیکن ساتھ ہی اس نے یہ تصریح بھی کردی ہے کہ قرآن میں تمام رسولوں کاذکر نہیں کیا گیا۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ ﴿غافر:۷۸﴾

”اور اے پیغمبر ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی رسول مبعوث کئے۔ ان میں سے کُچھ ایسے ہیں جن کے حالات تمہیں سُنائے جاتے ہیں اور کُچھ ایسے ہیں جن کے حالات نہیں سُنائے۔

یہ ظاہر ہے کہ قومیں بے شمار گزر چکی ہی ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حسب تصریح قران ہر قوم میں دعوت حق کا ظہور ہوا ہے۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ بے شمار قومیں اور بے شمار دعوتیں ہوئیں جن میں سے صرف چند ہی کا قرآن نے ذکر کیا۔ باقی کا نہیں۔“

قُرآن نے ایسا کیوں کیا؟ تو اس کا سبب بالکل واضح ہے۔ قرآن کا مقصود ان سرگزشتوں کے بیان سے یہ نہیں تھا کہ تاریخ کی طرح تمام واقعات کا استقصاء کیا جائے۔ بلکہ صرف تذکیر و

موعظت تھا، اور تذکیر و موعظت کے لئے اس قدر کافی تھا کہ چند دعوتوں اور قوموں کی سرگزشتیں بیان کر دی جائیں اور باقی کے لئے کہ دیا جائے کہ ان کا حال بھی انہی پر قیاس کر لو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں اس کا اسلوب بیان یہ جگہ عام ہے۔ جابجا اسکی تعبیرات پائی جاتی ہیں کہ پچھلے قرنوں میں ایسا ہوا۔ پچھلی قوموں میں ایسا ہوا۔ پچھلی آبادیوں میں ایسا ہوا۔ پچھلے رسولوں کے ساتھ اس طرح کے معاملات پیش آئے۔ البتہ جہاں کہیں تخصیص کے ساتھ ذکر کیا ہے وہاں صرف چند قوموں ہی کی سرگزشتیں بیان کی ہیں۔ جس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ یہ چند سرگزشتیں پچھلی قوموں کے ایام و وقائع کا نمونہ سمجھی جائیں اور ان سے اندازہ کر لیا جائے کہ اس بارہ میں تمام اقوام عالم کی رودادیں کیسی رہ چکی ہیں؟

البتہ کہا جا سکتا ہے کہ کیوں خصوصیت کے ساتھ ان چند قوموں ہی کا ذکر کیا گیا جو ایک خاص خطہ ارضی میں گُزر چکی تھیں۔ دوسرے خطوں کی اقوام میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا؟

تو اس کے وجوہ بھی بالکل واضح ہیں اگر تھوڑی سی دقتِ نظر کام میں لائی جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایام و وقائع کے ذکر سے مقصود بعض مقاصد کے لئے استشہاد تھا اور یہ استشہاد جب ہی موثر ہو سکتا تھا کہ جن ایام و وقائع کا ذکر کیا جائے ان کے وقوع سے مخاطب بے خبر نہ ہوں۔ کم از کام انکی بھنک کانوں میں پڑ چکی ہو۔ یا نہ پڑھ ہو تو اپنے پاس کے آدمیوں سے حال پوچھ لے سکتے ہوں ورنہ ظاہر ہے کہ لوگ کہ دیتے پہلے ان وقائع کا وقوع ثابت کر دو، پھر ان سے ہمیں عبرت دلانا۔

اور اس طرح عبرت و تذکیر کا سارا مقصد ہی فوت ہو جاتا اب دیکھو قرآن نے جن ایام وو قائع کا ذکر کیا ہے وہ تمام تر کن خطوں میں واقع ہوئے تھے؟ یعنی انکی جغرافیائی حدود کیا ہلیں؟ یہ تمام وقائع یا تو خود عرب میں ہوئے یا سرزمیں دجلہ و فرات میں یا پھر فلسطین اور مصر میں اور یہ تمام خطے ایک دوسرے سے متصل تھے تجارتی قافلوں کی شاہراہوں سے باہم گر پیوستہ تھے آمد و رفت کے علائق کا قدیمی سلسلہ رکھتے تھے اور نسلی و لسانی تعلقات کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے تھے جیسا کہ آگے چل کر تمہیں معلوم ہو گا۔ پس قرآن نے انہی خطوں کا ذکر کیا جو فی الحقیقت تاریخ اقوام کا ایک ہی وسیع خطہ رہ چکا ہے دوسرے خطوں سے تعرض نہیں کیا کیونکہ مخاطبین کے لئے ان خطوں کا ذکر ان کی شب و روز کی باتوں کا ذکر تھا اور وہ جُھٹلانے کی جراَت نہیں کر سکتے تھے۔ عرب خود ان کا مُلک تھا ۔ عراق سے ان کے تعلقات تھے۔ فلسطین کے کھنڈروں پر ہر سال گُزرتے رہتے۔ مصر ان کے تجارتی قافلوں کی منڈی تھی۔ ان مُلکوں کا نام سُننا گویا اپنے چاروں طرف نظر اُٹھا کر دیکھ لینا تھا۔ پھر جن قوموں کا ذکر کیا گیا ان کے ناموں سے بھی وہ نا آشنا نہ تھے قوم تبع اور اصحاب اخدود یمن سے تعلق رکھتے تھے اور یمن عرب میں ہے۔

عاد اور ثمود کی بستیاں بھی عرب ہی کے حدود میں تھیں۔ قبیلہ مدین بالکل عرب کے پڑوس میں تھا۔ قوم لوط کے کھنڈر ان میں سے سیکڑوں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ سرزمینِ دجلہ و فرات کی قوموں اور ان کی روائتوں سے بھی نا آشنا نہیں ہو سکتے تھے۔ مصر میں گو مصر کے فرعون اب نہیں رہے تھے، لیکن مصر میں برابر آتے جاتے رہتے تھے۔ فراعِنہ کے نام ان کے

لیے اجنبی نام نہیں ہو سکتے تھے۔ علاوہ بریں یہودی اور عیسائی خود ان کے اندر بسے ہوئے تھے۔ انبیائے بنی اسرائیل کے نام ان لوگوں کی زبانوں پر تھے، تفصیلات ربیوں اور راہبوں کو معلوم تھیں۔ یہ ان سے پوچھ سکتے تھے اور پوچھا کرتے تھے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قران نے ایاّم ووقائع کے بیان واِستدلال میں جابجا اس طرح کا اُسلوب اختیار کیا ہے جیسے ایک جانی بُوجھی ہوئی بات کی طرف اشارہ کیا جائے۔

مثلاً جابجا فرمایا

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ ﴿ابراھیم:۹﴾

جو قومیں تم میں سے پہلے گُزر چکی ہیں کیا تم تک ان کی خبریں نہیں پہنچ چکی ہیں؟

یا مثلا جابجا اس طرح کی تعبیرات پاؤ گے:

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ﴿فاطر: ۴۴﴾

کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے پچھلی قوموں کا کیا انجام ہو چکا ہے؟

کیونکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ برابر چلتے پھرتے رہتے تھے۔ یعنی ہر موسم میں تجارت کے لئے نکلتے تھے اور اثنائے سفر میں کتنی ہی اُجڑی ہوئی بستیاں مٹتے ہوئے نشان اور سُنسان کھنڈر ان کی نظروں سے گُذرتے تھے بلکہ بسا اوقات انہی میں منزل کرتے اور انہی کے سایوں میں دوپہر کاٹتے تھے اور پھر جابجا اس طرح کی تصریحات ہیں کہ یہ مقامات تم سے دور نہیں کہ بعد کی وجہ سے بالکل

بے خبر رہے ہو۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ کیا علمائے بنی اسرائیل سے یہ سرگذشتیں نہیں سُنیں؟ اور اگر بے خبر ہو تو علم والوں سے یعنی علمائے اہل کتاب سے دریافت کر لو جو تم ہی میں بسے ہوئے ہیں۔ اور پھر بعض مقامات میں عرب کے حوالی و اطراف کی تصریح بھی کر دی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیان وقائع میں قصداً یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ سرزمین عرب اور اطراف جوانب ہی کے وقائع ہوں مثلاً سورۃ احقاف کی آیت ۲۷ میں قوم عاد کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُم مِّنَ الْقُرَى وَصَرَّفْنَا الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ

البتہ یہ ظاہر و معلوم ہے کہ ان واقعات کی تفصیلات سے لوگ نا آشنا تھے اور بعض وقائع ایسے تھے جن کی صرف کانوں میں بھنک پڑ چکی تھی لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ معاملہ کس طرح پیش آیا اور صحیح سرگزشت کیا ہے؟ نہ صرف عرب میں بلکہ ان خطوں میں بھی جہاں وہ پیش آئے تھے۔ جن وقائع کا ذکر تورات میں موجود تھا ان کی بھی بعض حقیقتیں محرف ہو گئیں تھیں۔ اور خود اہل کتاب کو بھی خبر نہ تھی کہ اصلیت کیا رہ چکی ہے۔ پس قرآن انکی حقیقت ٹھیک ٹھیک واضح کر دی۔ ہر معاملہ اپنی اصلی صورت میں نمایاں ہو گیا۔ بعض وقائع کی نسبت تصریح کر دی کہ اس سے باشندگان عرب بالکل نا آشنا تھے۔ یعنی نام تو سُن لیا تھا لیکن اس کی یہ تفصیلات اور جُزئیات کسی کو معلوم نہ تھیں، مثلاً اسی سورت میں حضرت نوح علیہ السّلام کی سرگزشت بیان کر کے آیت ۴۹ میں تصریح کر دی کہ یہ باتیں نہ تو تجھے معلوم تھیں نہ تیری قوم کو۔

جدید اثری تحقیقات اور اقوام متذکرہ قران

پھر فہم و تدبر کا ایک اور نُقطہ بھی ہے اور اس طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ قران نے جن خطوں کی اقوام کا ذکر کیا ہے دُنیا کو ان کی قدیم تاریخ بہت کم معلوم تھی۔ اور خود عرب اور عربی نسل کی ابتدائی سرگزشتیں بھی پردہَ خفا میں مستور تھیں۔ لیکن اٹھارویں صدی سے آثار قدیمہ کی تحقیقات کا نیا سلسلہ شروع ہوا اور پھر انیسویں صدی میں نئے نئے پردے اُٹھے اور اب بیسویں صدی کے اثری انکشافات روز بروز ایک خاص رُخ پر جارہے ہیں۔ ان سب سے عرب، عراق فلسطین شام اور مصر کی قدیم قوموں اور تمدنوں کے جو حالات منکشِف ہوئے ہیں انہوں نے ان خطوں کی قدیم تاریخ کو بالکل نئ شکل دے دی ہے اور روز بروز نئ نئ حقیقتیں اُبھرتی جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عربی نسل اور عربی زبان کے صرف اتنے ہی معنی نہیں ہیں جتنے آج تک سمجھے گئے ہیں بلکہ یہ قوموں اور نسلوں کی نہائت قدیم اور وسیع داستان ہے اور وہ دنیا کے ابتدائی تمدنوں میں عظیم الشان حصّہ لے چکے ہیں۔

ان تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عربی زبان اور اسکی ابتدائی شکلوں کے بولنے والوں کی ایک خاص نسل تسلیم کر لیا جائے تو یہ در اصل بہت سے گروہوں اور قبیلوں کا ایک مجموعہ تھا اور عرب فلسطین، شام مصر اور عراق کے خطوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس نے دنیا کے ابتدائی تمدن کی تعمیر میں بڑے بڑے حصے لیے۔ ان ملکوں کی وہ تمام قدیم

قومیں جو آج تک ایک دوسرے سے بالکل الگ سمجھی جاتی تھیں مثلاً اشوری، سریانی، فینیقی، مصری، آرامی وغیرہم، فی الحقیقت الگ نہ تھیں اور عربی زبان کا ابتدائی مواد اور عربی رسم الخط کے ابتدائی نقوش ان سب میں مشترک تھے۔ حتیٰ کہ انہی گروہوں نے مصر کے تختِ عظمت و جبروت پر عرصہ تک شہنشاہ کی اور اپنی زبان وقت کی تمام متمدن قوموں کو مُستعار دے دی۔ چنانچہ دارا کے کتبوں اور مصر کے ہیلوغنیفی نقوش میں عربی الفاظ آج تک پڑھے جاسکتے ہیں اور یہ بات تو ایک تاریخی حقیقت کی طرح مان لی گئی ہے کہ یونانیوں نے فن کتابت کا پہلا سبق انہی اقوام سے حاصل کیا تھا؟

کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ اس سلسلہ میں کیا کیا انکشافات ہونے والے ہیں؟ تاہم جس قدر انکشافات ہو چکے ہیں ان سے ایک بات واضح ہو گئی ہے۔ یعنی ایک زمانہ میں یہ تمام خطے ایک خاص نسل کے عروج و انشعاب کے مختلف میدان تھے اور یہی نسل عربی قبائل کی ابتدائی نسل تھی۔ پس اگر قرآن نے صرف انہی خطوں کی اقوام کا ذکر کیا ہے، کوئی دوسری قوم اس دائرہ میں داخل نہیں ہو سکی ہے تو بہت ممکن ہے کہ علت اس سے کہیں زیادہ گہری ہو جس قدر اس وقت تک ہم سمجھتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں چار باتیں نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہیں

اولاً جن اقوام کا ذکر کیا گیا ہے ان کیا گیا ہے ان کی خصوصیت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ بعض سر زمین حجاز کے قرب و جوار میں گُزری تھیں بعض سے اہل کتاب واقف تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کوئی گہری بات ہے۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے یہ تمام قومیں اصلاً ایک ہی نسلی حلقہ کی ہیں حتیٰ کہ اگر مصریوں کا ذکر کیا گیا ہے تو مصری بھی اس میں داخل ہیں۔

ثانیاً ان انکشافات کی روشنی میں ایک اور مسئلہ بھی بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ قرآن نے جہاں کہیں ترتیب ظہور کے ساتھ دعوتوں کا ذکر کیا ہے وہاں قوم نوح کے بعد قوم عاد اور عاد کے بعد قوم ثمود نمایاں ہوئی ہے اور ان تینوں قوموں کا ایک دوسرے کا جانشین کہا ہے چنانچہ سورہ اعراف کی آئت ۶۹ میں ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا خدا کی یہ نعمت یاد کرو کہ اس نے تمہیں قوم نوح کے بعد اس کا جانشین بنایا اور آیت ۷۴ میں ہے کہ اسی طرح حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا تم قوم عاد کے بعد اس کے جانشین بنائے گئے ۔ چونکہ ان تینوں قوموں کا جغرافیائی محل ایک دوسرے سے الگ تھا اس لئے یہ بات واضح نہیں ہوتی تھی کہ اس خطاب کا صحیح مطلب کیا ہے؟ لیکن اب بالکل واضح ہو گئی اور ان توجیہوں کی ضرورت نہ رہی جو مفسرین نے اختیار کی ہیں۔

ثالثاً اس سوال پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ قرآن نے ہر جگہ یہ تذکرہ حضرت نوح علیہ السلام ہی سے کیوں شروع کیا ہے؟ اس کے متعدد وجوہ سامنے آتے تھے لیکن ان انکشافات کی روشنی نے

ایک نیا پہلو واضح کر دیا ہے یعنی حضرت نوح کی دعوت غالبا اس قدیم نسل میں پہلی دعوت تھی اور چونکہ پہلی دعوت تھی اس لئے ناگزیر تھا کہ اس کی دعوتوں کا تذکرا اسی سے شروع ہوا۔

رابعاً تورات کی بناپر سامی نسلوں اور زبانوں کی جو تقسیم کی گئی تھی اور جو اٹھارویں اور انیسویں صدی کے عُلمائے انساب والسنہ کے نزدیک بنیادی تقسیم رہے ہے اب متزلزل ہو رہی ہے اور معلوم ہوتا ہے از سرنو تقسیمیں کرنا پڑیں گی۔

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ {۳۸:۸۸}